مولانا عبد المجید سالک

حضرت شاہ ولی اللہؒ

حضرت اورنگ زیب عالمگیر اس ملک میں سرمایۂ ملّت کے نگہبان اور دین مقدس کے غیور خادم تھے اگرچہ ان کا زیادہ وقت جنوب کی چپقلشوں میں بسر ہوا۔ لیکن انھوں نے برّصغیر کی دینی۔ اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے امکان بھر کوشش کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین نہایت کمزور اور بے غیرت ثابت ہوئے اور مملکت اور معاشرہ دونوں انتہائی خلفشار میں مبتلا ہو گئے۔ سلاطین و امراء کی نالائقی۔ علماء کی غفلت و مداہنت عمال حکومت کی نمک حرامی اور اخلاق باختگی نے پورے معاشرے کو عقائد فاسدہ اور اعمال شنیعہ کے گرداب میں غرق کر دیا۔

اس وقت ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی جلیل القدر شخصیت پیدا ہو جو اسلامی نظام عقائد کے احیاء اور مسلم معاشرے کی تربیت و اصلاح کے انقلابی روح لے کر اُٹھے۔ اور صدیوں کے فرسودہ نظام کو خس و خاشاک سے پاک کر سکے نئی زندگی بخشے۔ اگر دیمک خوردہ مملکت کا احیا بعض حالات و کوائف کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو کم از کم مسلمانوں کو مسلمان بنانے اور فرقہ پرستی اور اوہام نوازی سے نجات دلانے کی صورت تو پیدا ہو جائے۔ چنانچہ مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے اسّی سال بعد اور عالمگیر اعظم کی وفات سے چار سال پہلے فروری ۱۷۰۳ء میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے جو اس برّصغیر میں محی السُنّۃ۔ وارثِ کمال نبوت اور حُجۃ الاسلام ثابت ہوئے اور جن کے فیوض و کمالات سے اسلام کو حیات تازہ حاصل ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور والدہ کی جانب سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے آپ کے دادا شیخ وجیہ الدین اورنگ زیب عالم گیر کے لشکر میں ایک ممتاز سردار تھے۔ والد ماجد شیخ عبد الرحیم دہلی کے نہایت نامور عالمِ دین اور صاحبِ دل بزرگ تھے جنہوں نے پُرانی دہلی میں ایک دینی درسگاہ "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ آپ دربار شاہی سے الگ تھلگ رہ کر درس و ارشاد میں مصروف رہتے تھے۔ البتہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کی جلالت علمی کے باعث آپ کو فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین میں شامل کر لیا تھا۔ آپ نہایت جامع حیثیات بزرگ تھے ظاہر و باطن میں کامل اور دنیاوی عقل و فراست میں فرد تھے۔ "انفاس العارفین" میں حضرت شاہ صاحب اپنے

والد محترم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودند و عقل معاد کامل وافر داشتند و مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیارے آموختند۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے سوانح حیات کے لئے مختلف کتب کی ورق گردانی سے بہتر ہے کہ خود حضرت کے خود نوشت حالات سے استفادہ کیا جائے۔ آپ نے اپنے حالات میں ایک مختصر رسالہ "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" کے نام سے لکھا تھا۔ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

یہ فقیر ۴ا۔ شوال ۱۱۱۴ھ کو بدھ کے دن طلوع آفتاب کے وقت تولد ہوا۔ تاریخی نام "عظیم الدین" نکلا۔ ولادت سے پہلے والدین اور بعض دوسرے صلحا نے میرے متعلق بعض مبشر خواب دیکھے۔ عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھایا گیا۔ ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرا دیا اسی سال رسم ختنہ ادا ہوئی۔ اور اسی سال قرآن مجید ختم کر کے فارسی تعلیم شروع کی۔ یہاں تک کہ دسویں سال شرح ملا جامی پڑھ لی۔ اور عربی کتب کے مطالعہ کی قابلیت پیدا ہو گئی۔ چودھویں سال شادی ہو گئی۔ پندرہ سال کی عمر میں میں نے حضرت والد ماجد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مشائخ صوفیہ بالخصوص نقشبندیہ کے اشغال میں مصروف ہو گیا۔ اور توجہ و تلقین اور آداب طریقت کی تعلیم اور خرقہ پوشی کی جہت سے میں نے اپنی نسبت کو درست کیا۔ اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا اس ملک کے مروجہ نصاب تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ ذیل کی کتابیں میں نے سبقاً سبقاً پڑھیں۔

حدیث میں پوری مشکوٰۃ شریف (سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب تک) صحیح بخاری کتاب الطہارت تک۔ شمائل ترمذی کامل تفسیر بیضاوی۔ اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ۔ اس کے ساتھ ہی سب سے بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی۔ کہ والد ماجد کے درس قرآن میں باقاعدہ حاضر رہا۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پوری پڑھیں۔ اصول فقہ میں حسامی اور توضیح و تلویح کا کافی حصہ منطق میں شرح شمسیہ پوری پڑھی۔ اور شرح مسالعہ کا کچھ حصہ۔ کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف کا ایک حصہ۔ سلوک و تصوف میں عوارف۔ رسائل نقشبندیہ وغیرہ۔ علم الحقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی۔ لوائح۔ مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔ فن خواص اسماء و آیات میں والد ماجد کا خاص مجموعہ۔ طب میں موجز۔ فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ۔ نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی۔ علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی۔ ہیئت و حساب کے بعض مختصر رسالے۔ الحمد للہ کہ اس تحصیل کے زمانے میں ہر فن سے خاص مناسبت پیدا ہو گئی۔

میری عمر کے سترھویں سال والد ماجد واصل بحق ہوئے۔ اور مرض الموت میں مجھے بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت عمر بھر مجھ سے راضی رہے۔ آپ کی وفات کے بارہ سال تک دینی کتب اور معقولات کے درس میں مشغول رہا۔ مذاہب فقہ کی کتابیں بغور پڑھیں۔ ان احادیث کا مطالعہ کیا جن سے فقہائے محدثین اپنے مسائل میں استناد کرتے رہے۔

اس کے بعد زیارت حرمین شریفین کا شوق پیدا ہوا۔ اور ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں یہ فقیر حج سے مشرف ہوا۔ ۱۱۴۴ھ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رہا۔ اور شیخ ابوطاہر قدس سرہٗ اور دیگر مشائخ حرمین سے اخذ روایت حدیث کی سعادت حاصل ہوئی۔ دوران قیام مدینہ منورہ میں روضۂ مقدسہ میری توجہ کا خاص مرکز رہا۔ اور الحمد اللہ کہ اس دربار قدسی سے مجھ پر فیوض وبرکات کی بے پایاں بارش ہوئی حضرت شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے تمام طرق صوفیہ کا جامع خرقہ عنایت ہوا۔ ۱۱۴۴ھ کے آخر میں دوبارہ حج کیا۔ اور اوائل ۱۱۴۵ھ میں وطن واپس آئے:۔

حج سے واپس آکر شاہ صاحب نے بدستور والد ماجد کے مدرسہ رحیمیہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آخر ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء بمقام دہلی رحلت فرمائی۔ تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے:۔

"او بود امام اعظم دیں"

حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری عمر اس کرب انگیز اور دردناک خلفشار کو دیکھتے ہی گذر گئی۔ جس کا ذکر اس فصل کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ آپ نے حکومت کے ضعف۔ معاشرے کی گمراہی اور علما ومشائخ کی غفلت وغلط کاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور دس بادشاہوں کا عہد آپ کے سامنے گذرا۔ آپ نے دیکھا کہ برصغیر کے مروجہ نصاب دینی یعنی درس نظامی میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ حدیث کے علوم فراموش ہو چکے ہیں۔ فقہ میں مذاہب اربعہ کی کھینچ تان اور تعصب باہمی کا دور دورہ ہے۔ اجتہاد کا نام نشان تک نہیں۔ عوام انتہائی گمراہی اور اوہام پرستی میں مبتلا ہیں۔ اخلاق کے بندھن کمزور پڑ چکے ہیں۔ معاشرے کے تمام طبقات غافل ہیں اور تباہی وبربادی کے راستے پر گامزن ہیں۔ علما ومشائخ نے شریعت وطریقت دونوں کو کھیل بنا رکھا ہے اور اسلام کے روشن چہرے کو اپنے عقائد فاسدہ اور اعمال بد سے داغدار کرنے میں مصروف ہیں۔ آپ نے اپنے علم وفضل۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت اور اپنی فراست ودردمندی کے طفیل سے تجدید واصلاح کا عزم کر لیا۔ اور متعدد انقلاب انگیز کتابیں لکھ کر جمود وقدامت کے پردوں کو چاک کر دیا۔

نواب صدیق حسن خان نے بالکل درست فرمایا کہ اگر شاہ صاحب زمانۂ ماضی میں پیدا ہوئے ہوتے

تو پورا عالم اسلام اُن کو امام تسلیم کر لیتا۔ اگر وجود اور در صدر اول ودر زمانہ ماضی می بود۔ امام الائمہ وتاج المجتہدین شمرده می شد۔

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :۔ ابن تیمیہ اور ابن رُشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل ودماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ آخیر زمانے میں کہ اسلام کا نفس واپسیں تھا شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی۔ رازی۔ ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے (تاریخ علم الکلام)

مولانا ابوالکلام آزاد نے "تذکرہ" میں لکھا ہے :۔

پھر بارھویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علوم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چلی تھی۔ پھر بھی کھیتوں کی سبزی۔ چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام کاروبار علم وطریقت کے اکابر و اساتذہ اسی صدی میں سر برآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسل درس وتدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں۔ بایں ہمہ معلوم ہے۔ کہ جو دور آخر کے فاتح اور سلطانِ عصر ہونے کا مقام تھا اور قطبیت وقت کا۔ وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رضی اللہ عنہ) ہی کے لئے تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ رہے کام کرتے رہے۔ مگر جو کام یہاں انجام پایا۔ وہ صرف یہیں کے لئے تھا۔

اب ہم مختصراً اُن کارناموں کا ذکر کریں گے جو اس جلیل القدر امام نے دینِ اسلام۔ معاشرہ اسلامی بلکہ پوری نسل اِسلامی کی خدمت و ہدایت کے لئے انجام دیئے۔ اور جنہوں نے اُن کو دنیا کے عظیم ترین رہنمایانِ فکر کی صف میں ممتاز مقام عطا کر دیا۔

صدیوں سے ہندی مسلمانوں کا یہ شیوہ چلا آتا ہے کہ قرآن مجید کو محض یُمن وبرکت کے لئے پڑھتے۔ اور اس کی ہدایت سے براہِ راست مستفید ہونے کی کوشش نہ کرتے۔ غیر عرب قوموں کو کلام الٰہی کا منشا سمجھانے کے لئے اس کا ترجمہ ضروری تھا۔ اور اس کی تفسیر کو بھی آسان بنانا لازمی تھا۔ دینی مدارس میں۔ فقہ۔ فلسفہ۔ منطق۔ صرف نحو سبھی کچھ پڑھایا جاتا تھا۔ لیکن کلام الٰہی اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتدریس کو چنداں اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ اور شیخ عبدالحق محدث رحمتہ اللہ علیہ اس سلسلے میں خاصی جدوجہد کر چکے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ تاکہ کلام الٰہی کو زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں۔ اس پر علماء اس قدر برافروختہ ہوئے۔ کہ تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ بعض ملاّؤں نے ایک دفعہ کوئی سو سوا سو بازاری غنڈوں کو ساتھ لے کر شاہ صاحب کو فتحپور کی مسجد میں گھیر لیا۔ اُن کے

ساتھ اس وقت صرف چند رفیق تھے۔ قریب تھا کہ ہنگامہ ہو جائے۔ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:۔

"شاہ صاحب کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی لکڑی تھی۔ اس لڑکی کو لے کر اس خونی مجمع کے سامنے آئے۔ جبا ضابطہ تلواروں۔ اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھا۔ غیر معمولی جوش کی حالت میں اَللّٰہُ اکبر کا نعرہ مارا۔ اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے۔

بعض احباب نے شاہ صاحب کو مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لئے دہلی سے چلے جائیں۔ اور جب فتنہ فرو ہو جائے تو واپس آجائیں چنانچہ شاہ صاحب باہر چلے گئے۔ اور جب واپس آئے۔ تو لوگوں کو سمجھایا کہ قرآن مجید کوئی منتروں کی کتاب نہیں ہے۔ کہ اس کو پوجا کے وقت جزدان سے نکال کر پڑھ لیا جائے اور بس۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جو بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ اگر تم اس کو سمجھو گے نہیں۔ تو عمل کیا کرو گے۔

بہر حال شاہ صاحب کے ترجمہ سے آئندہ قرآن مجید کے ترجموں کا دروازہ کھل گیا۔ ترجمے کے لفظی و معنوی صحت و احتیاط کے اعتبار سے شاہ صاحب کا ترجمہ اب تک نظیر نہیں رکھتا۔ ترجمہ کے ساتھ ہی آپ نے ایک مقدمہ بھی لکھا جس ترجموں کی رہنمائی کے لئے مفید ہدایت دیں۔ علم تفسیر پر بھی کتابیں لکھیں۔ جن میں "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" نہایت کارآمد اور اس کا اردو ترجمہ بھی علی گڈھ سے شائع ہو چکا ہے۔ نسخ آیات۔ روایات اسرائیلی اور رسوم جاہلیت کے متعلق بھی شاہ صاحب نے صحیح راستہ دکھایا کیونکہ علماء ان امور میں بہت الجھے ہوئے تھے۔ ان سے فہم قرآن میں رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔

اگرچہ شیخ عبدالحق محدث نے ہندوستان میں حدیث کا ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے علم و فضل کی پوری قوت صرف کی۔ لیکن چونکہ عالمگیر کے زمانے میں فقہ کا دور دورہ ہو گیا۔ اور علماء زیادہ تر قاضی و مفتی بننے لگے۔ یہی سبب ہے کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پھر کنج کس مپرسی میں چلی گئی۔ آخر شاہ ولی اللہ نے اس کو مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لئے از سر نو زندہ کیا۔ آپ نے اپنے سفر حجاز میں جہاں بڑے ارباب طریقت کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ اور اپنے باطن کو جلا دی۔ وہاں بہترین اساتذۂ حدیث سے علوم حدیث کی سند تکمیل بھی حاصل کی۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دل کشی اور دین میں اس کی برتر افادیت نے شاہ صاحب کو اس قدر متاثر کیا کہ آپ مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے تو اپنے استاذ حدیث سے کہنے لگے۔

ہر چہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین (یعنی حدیث)

(ملفوظات عزیزیہ صفحہ ۹۳)

شاہ عبدالعزیز نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے:۔

"میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے۔ آپنے چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر سند حاصل فرمائی"۔

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں :-

" اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علماء اس زمانہ میں علم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے۔ تو اس علم کے زوال وفنا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔" (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ)

"ھندوستان کے عُلماء" سے مراد صرف شاہ ولی اللہ۔ ان کے جانشین اور ان کے تلامذہ ہیں۔ جن کے طفیل سے علم حدیث نے ہندوستان میں وہ فروغ حاصل کیا۔ کہ اسلامی ملکوں میں سے کوئی اس ملک کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

شاہ ولی اللہ اپنے وصیت نامے میں فرماتے ہیں کہ جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے۔ تو موطا امام مالک (بروایت یحیٰی بن یحیٰی مصمودی) ضرور پڑھا دیں۔ کیونکہ یہ کتاب علم حدیث کی اصل ہے اور اس کے پڑھنے سے بہت فیض حاصل ہوتا ہے۔ آپ نے موطا کی شرح عربی میں " المسوّیٰ" اور فارسی میں " المصفّیٰ" کے نام سے لکھی۔ عوام کے لئے احادیث کے چھوٹے چھوٹے رسالے مرتب کئے۔ مثلاً چہل حدیث۔ النوادر من الحدیث۔ الدرالثمین فی مبشرات النبی الکریم۔ جب شاہ صاحب نے حجاز سے واپس آکر دہلی میں درس حدیث کا آغاز فرمایا۔ تو مدرسۂ رحیمیہ کی وسعت تنگ ہوگئی۔ اور ملک بھر کے اطراف واکناف سے تشنگانِ حدیث نبوی جوق در جوق رجوع کرنے لگے اس موقع پر محمد شاہ نے مولانا کو بلوا کر اندرونِ شہر ایک عالیشان مکان دے دیا۔ وہ مکان کیا تھا ایک بہت بڑی امیری حویلی تھی۔ جس میں شاہ ولی اللہ۔ شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق درس دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں یہ حویلی بھی لٹ گئی۔ اب اس کی جگہ محلہ مدرسہ شاہ عبدالعزیز" قائم ہے۔ یعنی یہ حویلی ایک پورے محلہ کی وسعت رکھتی تھی۔

حضرت شاہ صاحب کے درسِ حدیث اور ان کی کتابوں سے ہندوستان میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عام غلغلہ بلند ہوگیا۔ اور یہی شاہ صاحب کے منصب جدید و احیائے اسلام کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کو زید و عمر کے اقوال سے ہٹا کر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف لایا جائے۔

شاہ ولی اللہ نے مذاہب فقہ اور مسئلۂ تقلید و اجتہاد میں ایک معقول اور متوسط طریق اختیار کیا۔ انھوں نے چاروں مذاہب فقہ کے اختلافات کی بنیاد کو واضح کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی " الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اس میں خلافتِ راشدہ سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین جمع حدیث اور مختلف مذاہب فقہی کی ناقدانہ تاریخ لکھی ہے۔ حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی مذاہب کیونکر پیدا ہوئے۔ ان کی خصوصیات کیا کیا ہیں۔ ان کی جداگانہ حیثیتیں کیونکر قائم ہوئیں۔ احادیث کیونکر جمع ہوئیں۔ بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ ابو داؤد وغیرہم کے مجموعوں کی خصوصیات کیا ہیں۔ اجتہاد کی اہمیت کیا ہے اور مسلمانوں میں تقلید کا

رواج کسی وجوہ کی بنا پر ہوگیا۔ ان تمام مطالب کو اس کتاب میں تحقیقی اور دلنشین طور پر واضح کیا ہے۔

تقلید و عدم تقلید اور استخراج احکام فقہی کے متعلق شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ فقہ کے چاروں امام معتبر اس لئے اگر علماء ائمہ میں سے کسی ایک کا قول کسی مصلحت کی وجہ سے اختیار کریں۔ تو بالکل جائز ہوگا پھر فرمایا:

اگر انسان کسی مجتہد کے (جس کو اجتہاد کا حق ہو) ایسے قول کی جستجو کرے جو اس کے نفس پر سہل تر ہو تو ہم کو معلوم نہیں کہ شرع نے اُس عمل پر اُس کی برائی کی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوتی تھیں۔ ان ہی کو پسند فرماتے تھے۔ (عقدِ الجید (صفحہ ۷۲)

شاہ صاحب کا مسلک یہ تھا۔ کہ عامیوں کے لئے تقلید ہی بہتر ہے کیونکہ اگر ان کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ تو جس ملک میں شریعت اسلامی رائج ہوگی۔ وہاں کا نظام بالکل درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن علماء کو اپنی بصیرت سے کام لینا چاہیئے۔ اُن پر "لزوم مذہب معینہ" کی پابندی نہیں۔ شاہ صاحب مذاہب اربعہ میں کوئی فرق نہیں کرتے کسی ایک کی جانبداری اور دوسرے مذاہب کی نکتہ چینی انھوں نے نہیں کی۔ بلکہ جو حکم کسی مذہب کا انہیں باعتبار استدلال یا استحسان پسند آیا۔ اس کو بے تکلف اختیار کر لیا۔ اپنی کتاب "تفہیمات الٰہیہ" میں لکھتے ہیں:

ابو حنیفہ اور شافعی کے مذہب زیادہ مشہور ہیں۔ اور مسلمانوں میں زیادہ پیرو بھی انہی کے پائے جاتے ہیں۔ کتابیں بھی انہیں کی زیادہ ہیں۔ فقہا۔ محدثین۔ مفسرین۔ متکلمین۔ صوفیہ زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں۔ اور حکومتیں اور عام لوگ زیادہ مذہب حنفی پر قائم ہیں۔ اس وقت جو امر حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کو ایک جا کر دیا جائے دونوں کے مسائل کو دو اوین حدیث سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے جو ان کے موافق ہوں ان کو باقی رکھا جائے۔ اور جس کی کوئی اصل نہ ملے اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں۔ اگر دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں۔ تو ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور اگر دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کر لئے جائیں۔ اور دونوں پر عمل کرنا صحیح قرار دیا جائے۔

شاہ صاحب نے "انصاف" میں بھی یہی فرمایا کہ اہل الحدیث اور اہل التخریج دونوں کے طریقوں کو جمع کیا جائے۔ اس مسلکِ اعتدل کے اختیار کرنے کے حق میں شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں اولہ و براہین کا انبار لگا دیا ہے۔ اور صرف اس مسلک ہی کے اعلان سے اہل سنت کے تمام اختلافات اور مذاہب اربعہ کے پیروؤں کی بے معنی لڑائیوں کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس سے تعصب۔ تقلید جامد کوتاہ نظری اور کج بحثی ختم ہو کر ایک طرف عوام الناس کے لئے سہولت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف علماء پر تحقیق و اجتہاد کا دروازہ ہرگز بند نہیں

ہُوا۔ بلکہ ہر زمانے میں کھلا رہے اور آئندہ بھی کھلا رہے گا۔ فرماتے ہیں۔ اجتہاد ہر زمانے میں فرض کفایہ ہے۔ اس لئے کہ مسائل کی کثرت پر کوئی حصر و احاطہ نہیں کر سکتا۔ اور اس میں احکام الٰہی کی معرفت ہر حال میں واجب ہے۔ شاہ صاحب نے اجتہاد کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں دیا۔ بلکہ نہایت تفصیل سے اس کے اصول و قواعد اور حدود و شرائط معین کئے ہیں۔ ازالۃ الخفا۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید۔ انصاف۔ بدور بازغہ۔ مصفیٰ وغیرہ ہر کتاب میں اس کے متعلق کہیں اشارات کئے ہیں۔ اور کہیں مفصل بحث کی ہے۔ اور مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔

بعض علما اس بحث میں پڑ جاتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ حنفی تھے۔ یا غیر مقلد۔ ہمارے نزدیک آپ اپنی عظمت علمی اور جلالت قدر کی وجہ سے ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے تھے۔ کہ اس قسم کی نسبتیں آپ کے لئے بے معنی ہو گئی تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا مسلک آپ کی کتابوں سے واضح ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق خود فیصلہ کر سکتا ہے حضرت شاہ صاحب نے تاریخ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ حنفی شافعی مالکی۔ حنبلی کی نسبتیں سلطنت اُموی کے خاتمہ تک بالکل معدوم تھیں۔ کوئی اپنے آپ کو حنفی شافعی وغیرہ نہ کہتا۔ بلکہ سب اپنے اپنے اماموں اور استادوں کے طریقے پر دلائل شرعی استنباط کرتے تھے۔ لیکن سلطنت عباسی کے زمانے میں یہ تبدیلی ہوئی کہ ان فرقوں کے نام معین ہو گئے۔ اور جب تک لوگ اپنے بڑوں کی نص نہ پاتے۔ کتاب و سنت کی دلیل بھی تسلیم نہ کرتے۔ پھر جب عربوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اور ترکی تسلط کا زمانہ آیا۔ اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے تو ہر ایک نے اپنے اپنے مذہب فقہی کو اصل بنا لیا۔ پہلے جو چیز مذہب مستنبط تھی۔ اب وہ سنت مستقرہ بن گئی۔ اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں۔ اور تفریع پر تفریع (ازالۃ الخفا)

مختصر یہ کہ حضرت شاہ ولی اللہ فقہ کے ائمہ اربعہ کی عظمت علمی اور ان کی نیک نیتی اور تقویٰ کے قائل ہیں۔ ان کے مذاہب کو بھی حق سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک تو اس کے روادار نہیں کہ کسی ایک امام اور اس کے مذہب سے ایسی وابستگی پیدا کی جائے۔ کہ حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی مستقل فرقے بن جائیں۔ دوسرے۔ کسی ایک امام کے مسئلے یا حکم پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بلکہ دوسرے ائمہ کے احکام بھی دیکھ لئے جائیں۔ اور جس حکم میں حُسنِ استدلال اور حُسنِ استحسان پایا جائے۔ یعنی جو قرآن و حدیث کے منشا سے زیادہ قریب ہو۔ اور ملت کے لئے زیادہ سہل ہو۔ وہ اختیار کر لیا جائے۔ خواہ وہ کسی امام کا ہو۔ گویا شاہ صاحب نے اس فقہی فرقہ بندی کی جڑ کاٹ دی۔ اور اجتہاد کا دروازہ کھول دیا۔ تاکہ خدا کا دین قیامت تک آفتاب ہدایت بنا رہے۔

واضح رہے کہ ایک خاص تقلید شاہ صاحب کے نزدیک حرام ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

اور تقلید حرام کی صورت یہ ہے کہ کسی فقیہ کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ وہ علم کی انتہا تک پہنچ گیا ہے اور اس سے خطا سرزد ہی نہیں ہو سکتی (یہ تقلید حرام اس لئے ہے کہ) کہ ایسے مقلد کو جب کوئی صحیح و صریح حدیث بھی پہنچ جاتی ہے جس سے فقیہ کے قول کی تردید ہوتی ہو۔ تو مقلد پھر بھی اس کو نہیں چھوڑتا۔

شاہ ولی اللہ نے علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی کی بھی باقاعدہ تعلیم پائی تھی اور اپنے قول کے مطابق اذکار و اشغال میں بھی مصروف رہے تھے ان کی اکثر تصانیف سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ رموز و اسرار ان کے سینہ صافی پر القا ہوتے تھے اللہ تعالیٰ "بروح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے فکر و اجتہاد کی رہنمائی ہوتی تھی" فیوض الحرمین" ان کے مکاشفات کا نہایت قیمتی مجموعہ ہے۔ بعض رویائے صادقہ بھی ان کی کتابوں میں درج ہیں۔ جن کے بعض حصے حیرت انگیز طور پر پورے بھی ہوئے۔ لیکن یاد رہے کہ وہ مروجہ تصوف کے سخت مخالف اور آج کل کے صوفیہ و مشائخ کے حرکات و افعال سے بے حد بیزار تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے اس امر کی توضیح بھی کی ہے کہ تصوف کا کتنا حصہ اسلام ہے اور کون کون سے اجنبی عناصر اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ آپ نے وحدت الوجود اور حضرت مجدد صاحب کی وحدت الشہود کو تاویل و تعبیر سے باہم مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی متعدد کتابیں تصوف میں ہیں۔ مثلاً الطاف القدس۔ لمعات۔ انفاس العارفین خیر کثیر۔ فیصلہ وحدت الوجود والشہود آپ کی مشہور کتاب تفہیمات الٰہیہ بھی زیادہ تر تصوف ہی کے مطالب پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ جھاڑ پھونک۔ تعویذ۔ شعبدات و نیرنجات سے تصوف کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمارے عوام اور ہمارے صوفیہ ان ہی کو کرامات قرار دے کر ان پر تصوف اور ولایت کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ان چیزوں کو باطل قرار دیا۔ اور ان کے متعلق "القول الجمیل" اور "شرح حزب البحر" جیسی کتابیں لکھ دیں۔ بلاشبہ شاہ صاحب بیعت کے قائل ہیں "القول الجمیل" میں آپ نے بیعت کے فوائد۔ اس کے طریقوں اور صاحب بیعت کے خصائص بیان کئے ہیں۔ لیکن ان کی تلقین یہی ہے کہ آج کل کے بدعتی پیروں کی بیعت ہرگز نہ کرو۔ اگر ان سے کوئی کرامت بھی دیکھو تو اس کو طلسمات سحر سمجھو۔ جس کو قرب الٰہی سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً وصیت نامے کی وصیت سوم ملاحظہ ہو۔

وصیت دیگر آنست کہ دست در دست مشائخ ایں زمان کہ بانواع بدعت مبتلا ہستند۔ ہرگز نباید داد۔ وبیعت ایشاں نباید کرد۔ و بغلو عام مغرور نباید بود و نہ بہ کرامات زیرا کہ اکثر غلو عام بسبب رسم است و امور رسمیہ را بحقیقت اعتبارے نیست و کرامات فروشان ایں زمانہ ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند۔

شاہ ولی اللہ کی دو کتابوں نے تاریخی معاشرتی اور سیاسی دوائر میں جو انقلاب فکر پیدا کیا ہے۔ ہندوستان بھر کے علماء ان کی جلیل القدر تصانیف کے اثرات اس انقلاب سے لگا نہیں کھا سکتے۔ "ازالۃ الخفا" اور "حجۃ اللہ البالغہ"

دو کتابیں ہر پڑھے لکھے مسلمان کو مستقل طور پر اپنے مطالعہ میں رکھنی چاہئیں۔ "ازالۃ الخفا" میں صاحب نے فلسفۂ تاریخ اور منشائے اسلام کو پیش نظر رکھ کر خلفا کی تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا۔ اس کے بعد کے حضرات کے متعلق شاہ صاحب خاموش ہیں۔ اور آپ کا ارشاد یہ ہے۔ کہ خاندان۔ نسب۔ ذاتی قوتِ جسمانی یا بہادری فضیلت کے لئے اتنی اہم نہیں ہیں۔ جس قدر اسلام کی عملی خدمت اہم ہے۔ یعنی جتنی کسی نے اسلام کی خدمت زیادہ کی ہے۔ اتنی ہی اس کو فضیلت حاصل ہے۔ شاہ صاحب نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ صرف خلفائے راشدین تک محدود قرار دی ہے۔ اور امویوں کی سلطنت کو دنیاوی ملوکیت کہا ہے۔ خلفا کے منہاج حکومت۔ ان کے حکام و عمال۔ ان کے زمانے میں مسلم معاشرہ اور دوسرے تمام متعلقات کو پیش نظر رکھ کر شاہ صاحب نے قرآن و حدیث کی رُو سے ان پر گفتگو کی ہے۔ اور ہر چیز نہایت جرأت کے ساتھ واشگاف طور پر بیان کر دی ہے۔ اس کتاب سے شیعہ و سنی دونوں فرقوں کی بعض غلط فہمیاں اور بے سر و پا فکر آرائیاں بے بنیاد ثابت ہو گئیں۔ اور اسلام کا نظامِ ریاست و سیاست بالکل واضح ہو کر سامنے آگیا۔

جس طرح امام غزالی نے "احیاء علوم الدین" کے نام سے ایک بے نظیر کتاب لکھ دی تھی۔ اور پوری ملت کو یونان کی ضلالت آموز افکار سے محفوظ کر کے دینِ قیم کے راستے پر اُستوار کر دیا تھا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" تصنیف فرما کر اپنے زمانے کے تمام طبقات کی ہدایت و رُشد کا سامان مہیا کر دیا۔ (مولوی عبدالرحیم سرحدی نے اس کتاب مستطاب کا ترجمہ سلیس و بامحاورہ اُردو میں کیا ہے جو غیر عربی دان لوگوں کے لئے بڑی نعمت ہے) اس کتاب میں پہلے مذاہب و شرائع کی مصلحتوں کا ذکر ہے۔ مذہب کی ضرورت۔ روح کی حقیقت جزا سزا۔ حقیقت موت جیسے بنیادی مسائل کی صراحت و وضاحت کی ہے پھر ان ہی معیاروں پر دینِ اسلام کے احکام کی مصلحت واضح کی ہے۔ ایمان۔ طہارت۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ احسان۔ معاملات۔ تدبیرِ منزل سیاست مدن۔ معیشت وغیرہ پر حدیث کی رُو سے بحث کی ہے شریعت کے ہر حکم کی مصلحتوں کو واضح کیا ہے۔ اور قرآن و حدیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر دینی حکم کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے شاہ صاحب اس خیال کے مخالف ہیں کہ "شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوتی۔ یا اعمال اور ان کی جزا میں کوئی مناسبت نہیں"۔ شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ احکامِ دین کے مصالح کو سمجھنا اور عقلاً اس کا قائل ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اعمال کا اثر نیتوں اور ان نفسیاتی حالتوں پر موقوف ہے جن سے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ اندھا دھند تعمیل حکم کرنے اور حکم کی مصلحت کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے میں فرق واضح ہے۔

غرض یہ کتاب "اسرارِ علومِ دین" "مصالح احکامِ دین"۔ اصلاحِ معاشرت۔ تنظیم معیشت و سیاست غرض دین و دُنیا کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں رہنمائی کرتی ہے۔ اور پڑھنے والے کے قلب پر اسلام کے منجانب اللہ

ہونے کا نقش بٹھا دیتی ہے۔

اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے جس زمانے میں زندگی بسر کی۔ وہ ہندوستان میں سخت ابتری۔ بدنظمی اور خونریزی کا زمانہ تھا۔ سلطنت دہلی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ فتنوں کی آندھی سے بجھ گیا۔ مرہٹوں اور سکھوں نے جنوب و شمال میں قیامت برپا کر دی۔ دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ ہزارہا انسانوں اور کروڑوں کی مالیت کے سامان کا نقصان ہوا۔ پانی پت میں مرہٹوں کو احمد شاہ ابدالی نے شکست دی۔ لیکن مسلمانوں کی سلطنت سنبھل نہ سکی۔ بنگال و بہار میں انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ اس دور فتن میں چپ چاپ تصنیف و تالیف میں مصروف رہے وہ جانتے تھے کہ اس وقت سلطنت مغلیہ کو عسکریت کی مدد سے دوبارہ قائم کرنا محال ہو چکا ہے۔ اس لئے ملت کے فکر و عمل کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ تاکہ معاشرہ تو اس غار میں گرنے سے محفوظ رہ جائے۔ فتنوں کے دور میں جب ملت کا کوئی سر دھڑ نہ رہا ہو۔ اور روک ٹوک کے تمام عوامل معطل ہو چکے ہوں۔ ملت ہمیشہ گمراہ ہو جایا کرتی ہے۔ اس کی اصلاح کے لئے ضروری تھا کہ اسلام کی تجدید اور اس کے نصب العین کا احیاء کیا جائے۔ اس کے روشن چہرے کو داغ دھبوں سے پاک کر کے ایک دفعہ پھر دنیا کے سامنے لایا جائے۔ معاشرت کی اصلاح کی جائے۔ اور ہندوؤں کی ہمسائیگی کی وجہ سے عقیدہ و عمل کی جو گمراہیاں مسلمانوں میں راہ پا گئی ہیں۔ ان کا قلع قمع کیا جائے۔ بادشاہوں۔ امیروں۔ افسروں۔ فوجیوں مولویوں اور عام لوگوں کو الگ الگ نیکی کی تلقین کی جائے اور ملت کے سیاسی و اقتصادی نظام پر نظر ثانی کی جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے عمر بھر یہی کیا۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب "تفہیمات الٰہیہ" کا وہ حصہ پڑھنا چاہیئے۔ جس میں انھوں نے تمام طبقات ملت کو دردمندانہ مخاطب کیا ہے ان کے عیب و نقائص صاف صاف شمار کرائے ہیں۔ اور انھیں صراط مستقیم کی طرف دعوت دی ہے۔ تفہیمات کا یہ حصہ نہایت مؤثر ہے۔ جس سے شاہ صاحب کی شدت احساس اور دردمندی واضح ہوتی ہے۔

جب ارباب حکومت عیاشانہ و مسرفانہ زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان کی رئیس سے خوشحال اور دولت مند طبقہ بھی اسی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ تو اقتصادی توازن تلپٹ ہو جاتا ہے۔ اور اخلاقی و معاشرتی حالات بگڑ جاتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر لکھا ہے۔

(ہمارے زمانے میں) شہری زندگی کی بربادی کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ بیت المال۔ (پبلک فنڈ) پر پل پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کا پیشہ ہی یہ ہو جاتا ہے۔ کہ بیت المال سے روپیہ وصول کریں۔ کہ ہم غازی ہیں۔ بعض علماء کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا بھی بیت المال پر حق ہے۔ بعض زہاد۔ شعرا۔ اور دوسرے مانگ کھانے والے لوگ بھی بیت المال کو ہی کو اپنا ذریعہ آمدنی بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ کوئی فرض منصبی بجا نہیں لاتے۔ رفتہ رفتہ ان طفیلیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ شہر کے لئے۔ اپنے آپ کے لئے اور ملت کے لئے بار گراں

بن جاتے ہیں۔

دوسرا عنصر تمدن کی تباہی کا یہ ہے۔ کہ کاشتکاروں، تاجروں اور اہل حرفہ پر ناقابل برداشت ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ اور ان کی وصولی سختی سے کی جاتی ہے۔ جو لوگ اطاعت کے ساتھ ٹیکس ادا کرتے رہتے ہیں وہ اس کی گرانباری کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں اور جو طاقتور ہوتے ہیں وہ ٹیکس دینے سے انکار کر کے بغاوت اختیار کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں تمدن کی بہتری اسی میں ہے کہ ٹیکس ہلکے ہوں۔ اور ملازم ضرورت سے زیادہ نہ رکھے جائیں (حجۃ اللہ صفحہ ۴۵)

اقتصادیات و معاشیات کے مسائل پر شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور ہدور بازغہ میں "ارتفاقات" کے عنوان سے جو اصول پیش کئے ہیں ان کو اگر کوئی مسلم حکومت اپنا دستور اساسی بنالے تو اس کی مملکت یقیناً اقتصادی بیچینی اور طبقاتی کشمکش سے بہت بڑی حد تک محفوظ رہے گی۔ انہی "ارباب ارتفاقات" مالیاتِ حکومت۔ نظام عدل۔ فوج پولیس یہاں تک بلدیات وغیرہ کی تنظیم کا نقشہ بھی پیش کر دیا ہے۔

"فیوض الحرمین" میں شاہ صاحب نے تحقیق شریف کے عنوان سے ایک نہایت کارآمد بحث کی ہے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مسلمان کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ ظاہری خلافت والوں اور باطنی خلافت والوں کے لئے حضورؐ کی زندگی میں پوری ہدایت موجود ہے۔ اب ظاہری و باطنی خلافت کی تصریح سنئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ جو لوگ۔

شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری۔ سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی اور حفاظت۔ وفود کو انعام و اکرام دینے کی خدمت۔ محصول۔ مالگزاری اور صدقات کی وصولی۔ پھر حق داروں میں اُن کی تقسیم۔ مقدمات کے فیصلے۔ یتیموں کی نگرانی۔ مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام۔ راستوں، سڑکوں اور مسجدوں وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے دوسرے کاموں پر مامور ہیں۔ . . . . . میں انھیں "خلافت ظاہری" والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ ان لوگوں کے لئے رسول اللہ کی سیرت میں بہترین نمونے ہیں جن کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ پھر جو لوگ۔

شرائع و قوانین۔ اسلامی۔ قرآن۔ سُنن و آثار کی تعلیم دیتے ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے۔ خواہ مناظرہ یا مباحثہ کی راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے یا وعظ و پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے واعظین۔ خطبا اور مقررین کرتے ہیں۔ پھر جو توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ مثلاً مشائخ و صوفیہ ان کے علاوہ جو نماز قائم کراتے ہیں۔ حج کراتے ہیں۔ اور احسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں

کو بتاتے ہیں اور زہد و تقویٰ کی طرف راغب کرتے ہیں .....

ان کو میں "خلافت باطنی" والوں کے لقب سے ملقب کرتا ہوں۔ ان لوگوں کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بہترین نمونے ہیں۔ جن کی تفصیل کتب حدیث میں درج ہے۔

شاہ صاحب کا خیال یہ ہے کہ اگر مسلم مملکت میں دو جماعتیں کام پر آمادہ ہوں۔ ایک جماعت سیاست دانی۔ زیباداری اور نظم و نسق میں مہارت رکھتی ہو۔ دوسری ترویج علم دین۔ تزکیہ باطن اور وعظ و تلقین کی اہل ہو۔ یہ دونوں جماعتیں تقسیم کار پر ملت کا کام کریں۔ اور دونوں اپنے اپنے کام کے لئے اسوۂ حسنہ نبوی سے جلب توفیق کریں۔ تو ان کے درمیان ہمیشہ یک آہنگی رہے گی۔ کبھی تصادم و تزاحم کی نوبت نہ آئیگی۔ اور ملت دینی و دنیاوی۔ اخلاقی و مادی سب پہلوؤں سے فلاح حاصل کرلے گی۔

اگر پاکستان شاہ صاحب کی اس تجویز کو اختیار کرلے۔ تو قدیم الخیال مولوی اور جدید تعلیم یافتہ کے درمیان کشمکش ختم کی جاسکتی ہے۔ اور ہماری مملکت ایک خوش انتظام اسلامی سلطنت بن سکتی ہے۔

سیاست و معاشیات کے متعلق شاہ صاحب کے نظریات کو تفصیلاً پیش کرنا بجائے خود ایک کتاب چاہتا ہے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ شاہ صاحب خیالات و عقائد کی اصلاح ہی کو کافی نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ مملکت اسلامی کا خیال بھی ان کے پیش نظر تھا۔ خواہ اس کا وجود کسی مستقبل بعید میں ظاہر ہو۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جب مرہٹوں کا فتنہ حد سے بڑھ گیا۔ تو شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی۔ اور نواب شجاع الدولہ اور نواب نجیب الدولہ کے ساتھ ملایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پانی پت کے میدان میں تیسری جنگ ہوئی۔ اور مرہٹوں کی قوت پر ایسی کاری ضرب لگائی گئی کہ وہ دوبارہ پنپ ہی نہ سکے۔ یہ ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے۔ دو سال بعد حضرت شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ زندہ رہتے تو شاید کوئی اور عملی کرشمہ بھی دکھاتے۔

مسلم ثقافت ہندوستان میں

مصنفہ:۔ مولانا عبدالمجید سالک

برا عظم پاک و ہند میں مسلم ثقافت کی ہزار سالہ تاریخ۔ قیمت دس روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور